باب۔ ۱۲

تمہید
فص شعیبیہ

قلب: واضح ہو کہ قلب کے معنیٰ الٹنے کے ہیں، بدلنے کے ہیں۔ دل کو قلب اس لیے کہتے ہیں کہ وہ الٹا لٹک رہا ہے۔ جسم میں قلب مرکز حیات ہے۔ خون کو پمپ کر کے تمام جسم میں دوڑاتا ہے۔ سب سے پہلے جو شئے جسم میں حرکت کرتی ہے وہ "دل" ہے۔ سب کے بعد جو عضو غیر متحرک ہوتا ہے وہ "دل" ہے۔ جانور (اور) ملائک ایک ہی حالت میں رہتے ہیں اور ان پر ایک ہی قسم کی تجلی ہوتی ہے۔ یہ تقلب، یعنی الٹ پلٹ (اور) مختلف حالتوں میں متغیر ہونا، انسان سے خاص ہے۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ،[(یعنی) وہ ہر وقت نئی شان میں جلوہ گر ہے،(الرحمٰن:۲۹)] کا مظہر، قلبِ انسان ہی ہے۔ لہٰذا قابلِ اعتبار قلب، عارف کا قلب ہے۔ جس انسان کا دل مختلف تجلیات کے ساتھ متغیر نہ ہو وہ صوفیہ کے پاس بمنزلۂ حیوان کے ہے۔

قلبِ انسانی تین قسم پر ہے:

۱۔ قلب منیب: مَّنْ خَشِيَ الرَّحْمَـٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ،[(یعنی) جو بے دیکھے رحمٰن سے ڈرتا ہے، اور ایسا دل لے کر حاضر ہوا ہے، جو خدا کی طرف رجوع کرنے والا ہے،(ق:۳۳)]۔ اس کے جلال سے مرعوب و متاثر ہوتا ہے۔۔۔ قلب منیب سے توبہ پیدا ہوتی ہے۔ خطراتِ نیک ظاہر ہوتے ہیں۔ تقویٰ، ریاضت اور عبادت اس کی صفت ہوتی ہے۔

۲۔ قلب سلیم: يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ۔إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّـهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ،(یعنی) اس دن کہ نہ مال کام آئے گا نہ اولاد کام آئے گی۔ مگر جو اللہ کے پاس قلبِ سلیم کے ساتھ حاضر ہو،(الشعرا:۸۸ اور ۸۹)۔ یہ قلب، حُب غیر اللہ (اور) طلب غیر اللہ سے محفوظ رہتا ہے۔ ادراکِ عبد و رب، طلبِ علم و عرفان اور شوقِ سلوک الی اللہ سے مالا مال رہتا ہے۔

۳۔ قلب شہید: إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ،[(یعنی)اس میں یاد دہانی ہے جس کے سینے میں دل ہو، اوردلِ حاضر کے ساتھ سنتا بھی ہو،(ق:۳۷)]۔ یہ قلب، نعمت سماعت و شہودِ باطنی سے ممتاز ہوتا ہے۔ اور کلام و شہودِ حق سے سرفراز ہوتا ہے۔ اس کو ہمیشہ دوام حضور رہتا ہے۔ قربِ فرائض میں رہتا ہے۔ قلب مومنِ عارف میں ہر طرح کی وسعت ہے، ہر تجلی کی سمائی ہے۔ آسمان وزمین کسی میں جمیع تجلیات، خصوصاً تجلیِ الٰہی وشان معبودیت کی گنجائش نہیں۔ یہی وجہ تو ہے کہ انسانِ کامل، اللہ کا خلیفہ اور مسجود ملائک ہوتا ہے۔ لا یسعنی ارضی ولا سمائی ولکن یسنع قلب عبدی المومن،(یعنی)نہ زمین مجھے سماتی ہے نہ آسمان، مگر مومن کا دل مجھے سماتا ہے،(حدیث قدسی، کتب الصوفیہ)۔

ارض وسما کہاں تری وسعت کو پاسکیں
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

یہ بات یاد رہے کہ جب تجلیِ الٰہی ہوتی ہے تو قلب میں ماسوا کی گنجائش نہیں رہتی۔ جتنا دل اتنی ہی تجلی۔ جتنی تجلی اتنا دل۔ جتنی استعداد اتنا ہی ظہور۔ جتنی طلب اتنی عطا۔ جیسا عقیدہ ویسا شہود۔ جیسا عبد ویسا رب۔ رب سے مراد وہ تجلیِ الٰہی ہے جس کے پرتو سے عبد کا ظہور ہوتا ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ ایک جنس دوسری جنس سے، ایک نوع دوسری نوع سے (اور) ایک فرد دوسرے فرد سے نہیں ملتا توان پر، پرتو افگنِ اسما بھی جدا ہوں گے۔ تجلیات بھی جدا ہوں گے۔ اس بات کو اس طرح سے بھی کہتے ہیں کہ ہر عبد کا رب جدا ہے۔ یعنی وہ تجلی جدا ہے جو اس کو نورِ وجود عطا کرتی ہے۔ مثلاً اگر زید پر عمرو کی تجلی ہو تو زید، زید کس طرح رہے گا۔ وہ تو عمرو ہو جائے گا۔ زید کے آئینے کے سامنے عمرو آجائے گا تو عمرو ہی نمایاں ہو گا۔ اس لیے ہر ایک عبد پر (اور) اس کے عین ثابتہ پر، اس کے حسبِ حیثیت تجلی ہوتی ہے۔

دیتا ہے ہر ایک کو حکیم — جس کی جیسی لیاقت ہے
وہی نمایاں ہوتا ہے — جس کی جیسی فطرت ہے

اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ عبد کے پاس اس کا رب محبوب ہے۔ اور ہر رب کے پاس اس کا عبد مرضی ہے، گو دوسرے کے پاس اس کا رب یا عبد، محبوب یا مرضی نہ ہو۔ یہی خیر و شر اضافی کا اقتضا ہے۔

ذاتِ مطلق (و) تجلیِ اعظم کے لحاظ سے اس کی اسکیم، اس کے پروگرام (اور) اس کی تقدیر کے لحاظ سے ہر شئے اپنے اپنے مقام میں خیر ہی خیر ہے۔ جس شئے میں اطلاقیت (یا موافق ہو جانے کی صلاحیت) زیادہ ہے اس میں خیر، کثیر ہے۔ جس میں محدودیت (اور اپنے ہی تک رہنا) زیادہ ہے اس میں خیر قلیل، اور شر زیادہ ہے۔

ہر شئے ترقی کرتی جاتی ہے۔ اس پر ہر لحظہ، ہر دم تازہ تجلی ہوتی ہے۔ مگر اس کے خاص دائرے کے اندر، اس کے عین ثابتہ (اور) حقیقت کونیہ و ممکنہ کے موافق۔

کیا استعداد مخلوق ہوتی اور پیدا کی جاتی ہے، یا استعداد کے موافق مخلوقیت ہوتی ہے۔۔۔؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عین ثابتہ کے ساتھ اس کی استعدادِ کلّی رہتی ہے، اور عین خارجیہ کے ساتھ تفصیلی استعدادات (رہتی ہیں)۔ عین ثابتہ جو معلوم الٰہی ہے غیر مخلوق ہے تو اس کے ساتھ اس کی استعدادِ کلّی بھی غیر مخلوق (ہے)۔ استعداد کے مطابق علم ہوتا ہے (اور) علم کے مطابق عطاو تجلی ہوتی ہے۔ یہ مرتبہ قبلِ کُن ہے لہٰذا مرتبۂ داخلی میں ہے، (اس لیے) قبلِ خلق ہے اور قدیم بقدم الٰہی ہے۔ یعنی جب سے خدا ہے تب سے اس کا علم ہے، اعیان ثابتہ ہیں (اور) ان کے کلّی استعدادات ہیں۔ عینِ خارجی بعدِ کُن ہے لہٰذا مخلوق ہے۔ اس کے ساتھ اس کی تفصیلی استعدادات بھی مخلوق ہیں۔ ہر پہلی استعداد مابعد کی استعداد کے لیے سبب اور مویّد (یعنی قوت دینے والی) ہے۔

یہ بات بھی خیال کرنے کے قابل ہے کہ ہر شخص اپنی حقیقت کو نہیں سمجھتا اور نہ اپنے رب کو اور (نہ) اُس تجلی کو جو اس پر ہو رہی ہے، جانتا ہے۔ وہ ایک غلط خیال کے سبب اپنے رب کے متعلق ایک عقیدہ گھڑ لیتا ہے۔ حالاں کہ اس کا رب فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ جب روزِ قیامت حجاب اٹھے گا تو اس کا رب اس کے عقیدے کے مطابق نہ نکلے گا، لہٰذا اس کی مدد نہ کرے گا۔ چوں کہ دنیا میں اس شخص نے اپنے حقیقی رب کی اطاعت نہیں کی (لہٰذا) یہی کشمکش سببِ عذاب ہو گی اور تمام عمر کی نادانی، دائمی عذاب کا موجب ہو گی۔

رحم کیا صرف بندوں پر ہوتا ہے یا کچھ رحم اللہ تعالیٰ اپنے آپ پر بھی کرتا ہے۔۔۔؟ اللہ کی ذات غنی ہے۔ اس کو کسی بات کی حاجت نہیں۔ وہ اپنی ذات پر رحم نہیں کرتا۔ مگر اسمائے الٰہیہ اپنے ظہور کو چاہتے ہیں، البتہ وہ ایک طور سے مظہر کے محتاج ہیں۔ لہٰذا باعتبار صفاتِ اضافیہ کے اللہ اپنے پر بھی رحم کرتا ہے۔ غنائے ذاتی الگ ہے، اور صفتِ اضافی میں مضاف کی طرف احتیاج، جدابات ہے۔ جیسے کھلانے پلانے میں جو زندگی کی بقا کے لیے ضروری ہیں، فقیر بادشاہ کا محتاج ہے اور اظہارِ سخاوت میں بادشاہ بھی فقیر کا محتاج ہے۔ باپ کا لفظ اس وقت تک صادق نہ آئے گا جب تک بیٹا نہ ہو۔ لہٰذا بیٹا، وجود میں باپ کا محتاج ہے اور باپ، باپ بننے میں بیٹے کا محتاج ہے۔

اللہ، اسم ذات ہے اس لیے اس کے مقابل کوئی نہیں۔ کوئی اس کا مظہر نہیں۔ وہ وجودِ محض ہے۔ اس کے مقابل عدم ہے۔ لہٰذا ذات ہمیشہ باطن میں رہے گی۔ صفات ظاہر ہوتے ہیں۔ الٰہ بمعنی معبود ہے لہٰذا اس کے مقابل عبد و عابد ہے {مالوہ لفظ، عربی زبان میں نہیں آتا}۔ رب کے مقابل مربوب ہے، خالق کے مقابل مخلوق ہے۔ غنی کے مقابل فقیر ہے۔

Siddiqui Publications